تصوف اور حضرت شاہ صاحبؒ

مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۱)

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر (بڑا) احسان کیا کہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان لوگوں کی صفائی کرتا رہتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں بتاتا ہے اور بالیقین یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) قبل سے صریح غلطی (یعنی کفر و شرک) میں (مبتلا) تھے۔

اس آیت کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ نبوت کو بیان کیا گیا ہے، لہٰذا مقاصدِ نبوت کا جاننا زیادہ ضروری ہوا تا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کام کو آپ کے بعد آپ کی امت جاری وساری رکھ سکے۔ اس آیتِ کریمہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے تین مقاصد بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ تلاوتِ آیات

۱۔ آل عمران: ۱۶۳

۲۔ تزکیۂ نفوس

۳۔ تعلیم کتاب و حکمت

سورۂ بقرہ (۲) اور سورۂ جمعہ (۳) میں بھی ان ہی الفاظ کو دہرایا گیا ہے۔ اس میں جو اہم چیز ہے، وہ تزکیۂ نفوس ہے۔ پھر اس تزکیۂ نفوس کو قرآن پاک کی مذکورہ آیت میں بعض جگہ مقدم کیا گیا اور بعض جگہ موخر کیا گیا ہے۔ اس تقدیم و تاخیر کے بارے میں صاحب روح المعانی کی رائے ہے کہ یہ نسخے کے اجزا ہیں۔ جس طرح حکیم یا ڈاکٹر ایک مرض کے مریضوں کے لیے چند ادویہ پر مشتمل جو نسخہ لکھتا ہے تو اجزا تو وہی رہتے ہیں، لیکن مرض کی نوعیت کے پیشِ نظر بعض اجزا کو مقدم کر دیتا ہے اور بعض کو موخر۔ اسی طرح قرآن کریم میں بھی بعض جگہ تزکیے کو مقدم کیا گیا اور بعض جگہ موخر، مقدم اس لیے کیا گیا کہ وہ اصل علت و غایت تھی اور موخر اس لیے کیا گیا کہ وہ تعلیمات کا نتیجہ تھی۔ غرض کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ نبوت میں سے ایک بڑا مقصد تزکیہ تھا اور اس کے معنی ہیں طہارت، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ظاہری اور باطنی نجاست سے پاک کرتے تھے۔

انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ جس طرح شریعت ظاہر کے لیے ہے، بالکل اسی طرح باطن کے لیے بھی ہے۔ چناں چہ انسان کے اندر بھی ہزاروں امراض اور بیماریاں ہیں، بالکل اسی طرح روحانی اور دینی اعتبار سے قلب کے اندر بھی ہزاروں بیماریاں ہیں جیسے حبِ جاہ، حبِ مال، حسد، بغض، عداوت، تکبر، کفر و شرک وغیرہ، یہ سارے انسان کے قلب کو بیمار کر دیتے ہیں۔ چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین جس طرح ظاہری اعمال کے لیے ہے، اسی طرح باطنی اعمال کے لیے بھی ہے، اس لیے آپ ﷺ کا ایک بڑا مقصد تزکیہ و طہارت، یعنی لوگوں کے قلوب کو پاک و صاف کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص شان تھی، اسی کو حضراتِ صوفیہ نے اپنے قلوب میں جذب کیا اور وہ اس کے مظہر بن گئے اور انہوں نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا۔

آج کل بہت سے لوگ تزکیے کا اس شان سے انکار کرتے ہیں، حال آں کہ اس

۲۔ البقرہ:۱۲۹

۳۔ الجمعہ:۲

کا انکار ناممکن ہے، خود قرآن پاک کی یہ آیتیں آپ کے سامنے ہیں اور وہ حدیث جس کو ام الاحادیث اور حدیثِ جبرائیل کہتے ہیں جو حدیث کی تمام کتابوں میں مذکور ہے، وہ ساری حدیثوں کی اصل ہے اور جتنی بھی احادیث ہیں، وہ سب اس کی شرح ہیں۔ جس طرح سورۂ فاتحہ ام القرآن ہے اور سارا قرآن اس کی شرح ہے، بالکل اسی اعتبار سے یہ حدیث ہے۔ اس حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے اس کو ایمان بتایا۔ پھر اس نے پوچھا: احسان کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ تم اپنے رب کی عبادت اس طور سے کرو جیسے کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم میں یہ بات نہ ہو تو کم سے کم یہ تو ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ احسان ہے جس کو اس آیت کے اندر تزکیے اور تصفیے کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔ لوگوں نے اور شارح احادیث نے اس موقع پر کہا ہے کہ یہ حدیث دو مرتبوں کو بیان کر رہی ہے، ایک مراقبہ اور دوسرا مشاہدہ، اور بعض کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ایک ہی مقام کو بیان کیا ہے، جیسا کہ مولانا سندھی وغیرہ کی رائے ہے۔

غرض کہ احسان ایک نسبت ہے جس کو یہاں تزکیے اور طہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۴)

یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے لیے دو چیزیں بھیجی ہیں، ایک کتاب اور دوسرے نور۔ کتاب کیا ہے؟ وہ کتابِ ہدایت ہے یعنی قرآن مجید، جس کی شرحیں موجود ہیں۔ اور نور کیا ہے؟ وہ ایک نسبت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ میں منتقل ہوئی اور صحابہؓ سے منتقل ہو کر تابعین میں اور تابعین کے بعد تبع تابعین میں، ان کے بعد ائمہ میں، ان کے بعد حضراتِ صوفیہ کے اندر وہی نسبتِ نوری ہے، جو ایک کے بعد دوسرے میں منتقل ہو رہی ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ ابھی تک اس کے اثرات وثمرات موجود ہیں۔

غرض جو لوگ تصوف کا انکار کرتے ہیں تو گویا وہ دین کے ایک بہت بڑے حصے کا انکار

۴۔ المائدہ:۱۵

کرتے ہیں، یعنی دین کے اندر روحانیت اور نورانیت کا جو پہلو ہے، وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ خود صحابۂ کرامؓ اور کبار صحابہؓ سب ہی اس نورانیت سے آراستہ تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا

کیف اصبحت

تم نے کیسے صبح کی؟

قال مؤمنا حقا

عرض کیا کہ میں بالکل سچے طور پر ایمان لایا

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ دیکھو تم بہت اہم بات کہہ رہے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس قسم کی بات کہنا کہ میں سچا مومن ہوں، مشکل ہے۔ اس کے بعد صحابیؓ نے عرض کیا کہ میں نے اس دنیا کو بالکل چھوڑ دیا، میں راتوں کو قیام کرتا ہوں اور جاگتا رہتا ہوں اور دن کو بھوکا رہتا ہوں، یعنی روزہ رکھتا ہوں، میں عرش الٰہی کو بالکل اپنے سامنے دیکھتا ہوں اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اہلِ جنت آپس میں مل رہے ہیں اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ دوزخی آپس میں ضم ہو رہے ہیں، لڑ رہے ہیں اور جہنم میں گر رہے ہیں۔ یہ حدیث صاف دلالت کرتی ہے کہ صحابہؓ کے اندر رب العلمین نے یہ کیفیت پیدا کر دی تھی کہ وہ عرشِ الٰہی کو اپنے سامنے دیکھتے تھے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کے انفاس قدسیہ کا اثر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی خاص طریقہ نہیں بتایا تھا، بل کہ ان کے اندر یہ صفتِ احسان آپ ﷺ کی صحبت اور عبادات یعنی نماز، روزہ، حج اور جہاد وغیرہ کو اخلاص کے ساتھ ادا کرنے سے پیدا ہو جاتی تھی۔

آج ہماری نماز اور روزوں میں وہ کیفیت نہیں ہے، اس لیے ہمیں ضرورت ہے کہ صوفیہ کے کسی نہ کسی حلقے سے ہمارا تعلق ہو اور کسی شیخ کے ساتھ وابستہ ہوں پھر ان کے اذکار و اوراد کی پابندی کریں تا کہ وہ کیفیت حاصل ہو، ورنہ جس شخص کے اندر نماز، روزہ، اوراد و ادعیہ سے احسان کی صفت پیدا ہو جائے تو اس کو کسی صوفی کی ضرورت نہیں۔

مولانا علی میاں نے اپنی کتاب میں مولانا اسماعیل کاندھلویؒ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ

مولانا اسماعیل جو حضرت شیخ الحدیثؒ کے دادا تھے، ان کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے انتقال کے بعد غسل وغیرہ میں دیر ہوگئی، کیوں کہ ان کے بہت مرید تھے، وہ دہلی، آگرہ وغیرہ دور دور سے آنے والے تھے، اس لیے ان کے انتظار میں دیر ہوگئی تو اس وقت ایک شخص کی آنکھ لگ گئی، جو اسی غم میں تھا۔ اس نے مولانا اسماعیلؒ کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہتے ہیں کہ جلدی کرو، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہؓ میرے انتظار میں ہیں، یہ تھا ان کا مقام۔ نیز مولانا اسماعیل صاحبؒ کے لیے لکھا ہے کہ وہ مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس دور کے قطب الاقطاب اور ساری دنیا کے مرجعِ خلائق تھے اور عرض کیا کہ حضرت میں صرف نماز، روزہ، تہجد اور یہ اذکار و اوراد کرتا ہوں اور میں سلسلے کے جواذ کار ہیں، وہ نہیں کرتا تو میرے لیے کیا حکم ہے؟ حضرت گنگوہیؒ نے کچھ دیر توقف کیا اور مراقبے کے بعد فرمایا کہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ جو صفتِ احسان درکار تھی وہ اللہ رب العالمین نے آپ کے نماز، روزے اور حج وغیرہ سے پوری فرمادی۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے اندر ایسی قوت موجود ہے کہ وہ اس صفتِ احسان کو نماز، روزے اور حج وغیرہ سے پورا کرسکتا ہے تو پورا کرے، لیکن یہ پوری نہیں ہوتی، اس لیے کہ آج انسان کے ساتھ مادیت کا دور اور کشاکشِ حیات ہے اور دنیا کے عجیب وغریب حالات پیدا ہوگئے ہیں پھر اتنے مانع اور موانع ہیں کہ انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا ہونا مشکل ہے، اسی لیے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین سے خود یہ سلاسل کے سلسلے شروع کیے، تاکہ صفتِ احسان پیدا ہو۔ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث موجود ہیں۔ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ جو قلوب ہیں یہ ایسے زنگ آلود ہو جاتے ہیں، جیسے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ آپ لوہے کو کسی ایسی ہوا میں رکھ دیں جو مخالف ہو تو جلد ہی اس پر زنگ آجائے گا یا آپ لوہے پر پانی ڈال دیں یا کوئی اور چیز ڈال دیں تو زنگ آجائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بالکل اسی طرح انسان کے قلوب پر بھی (گناہوں کے سبب) زنگ آجاتا ہے۔ اور ان کی جلا کیا ہے؟ وہ اللہ کا ذکر ہے۔

بزرگوں نے لکھا ہے کہ ذکر اللہ کی تین صورتیں ہیں۔ ایک ذکرِ لسانی، دوسرے ذکرِ قلبی

اور تیسرے ذکرِ بالجوارح۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے کہا ہے کہ سب سے زیادہ جو فائق اور ممتاز عبادت ہے اور جس کو عماد الدین کہا گیا ہے، وہ نماز ہے اس لیے کہ نماز جامع اذکار ہے۔ اس میں تینوں قسم کے ذکر موجود ہیں، اس میں قلبی ذکر بھی موجود ہے اور لسانی ذکر بھی، اور جوارح کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس لیے کہ انسان نماز میں قیام کر کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے، وہ رکوع اور سجدہ کر کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے غرض کہ یہ سارے اذکار ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا جو بڑا مقصد تھا، وہ تزکیہ تھا اور اس تزکیے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ کثرت احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ اور صحابۂ کرامؓ اور تابعین سب مزکی ومطہر تھے، ان کے قلوب بالکل پاک صاف تھے اور وہ اخلاق کے اعلیٰ مقام پر تھے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ صحابہؓ کا وہ درجہ ہے کہ اگر تم احد پہاڑ کے برابر کوئی چیز خرچ کرو اور صحابہؓ وہی چیز ایک مُد یا اس کے نصف خرچ کریں تو بھی وہ اجر کے زیادہ مستحق ہیں، کیوں کہ صحابہؓ کا مقام اخلاص کی وجہ سے زیادہ بلند ہے۔ اور انسان کے اندر اخلاص اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا اللہ رب العالمین کے ساتھ صحیح تعلق اور اس کے قلب میں تزکیہ اور طہارت نہ پیدا ہو جائے۔

غرض تزکیہ اور طہارت مقاصدِ نبوت میں سے ہے اور یہ مخصوص چیز ہے اور سلف نے اس کو بڑی محنتوں سے حاصل کیا، پھر ان حضرات نے جو یہ سلاسل (نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، اور سہروردیہ وغیرہ) قائم کیے ہیں، یہ بھی ایسے ہی ہیں جیسے فقہ کے اندر مکاتبِ فکر ہیں۔ یہ بھی اسی قسم کی چیزیں ہیں اور ان سب کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے وصول الی اللہ، جو موقوف ہے اوراد واذکار پر، اور اوراد واذکار اس لیے ہوتے ہیں کہ ان سے مردہ قلوب کے اندر حیات پیدا ہو جائے۔ اس لیے کہ قلوب کی بھی زندگی ہے، جیسا کہ انسان کی زندگی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انسان جب گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب میں ایک نقطہ لگ جاتا ہے، اگر وہ توبہ کرلے تو توبہ ایسی چیز ہے جیسا کہ پانی، اور پانی سے چیز دھل جاتی ہے تو توبہ اس کے سارے گناہوں کو دھو دیتی ہے۔ اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو وہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے اور بڑھتے بڑھتے اس کے قلب کو گھیر لیتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ذٰلک

موت القلب (یہ قلب کی موت ہے)۔

دنیا تو اس کو زندہ سمجھتی ہے اور چلتا پھرتا دیکھتی ہے، لیکن اللہ اور رسول کے ہاں اس کی موت ہوگئی۔ تو یہ ذکر دراصل حیاتِ قلب ہے۔

اس سلسلے میں اللہ رب العالمین نے بہت سے اشخاص پیدا کیے اور بہ کثرت اربابِ حقائق پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے زمانے میں اس قسم کا کام کیا اور بہت سے لوگوں کی اصلاح کی۔ ان ہی لوگوں میں سے حضرت مولانا زوّار حسین صاحبؒ بھی تھے۔

حضرت مولانا زوّار حسین صاحبؒ عجیب آدمی تھے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی خود بنائی۔ یہ ان کی زندگی کی خصوصیت ہے جو میں سمجھتا ہوں اور لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ والدین ان کی زندگی بناتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی خود بنائی اور اللہ رب العالمین کی مدد میرے شامل حال رہی۔

مولانا زوّار حسین صاحبؒ نے ایک شیعہ گھرانے میں آنکھ کھولی اور سارا گرد و پیش سب کا سب شیعہ تھا، اللہ رب العالمین نے ان کو ہدایت دی اور توفیق دی اور ان کو سنی بنایا، اس کے بعد وہ بہت اونچے درجے کے اور مضبوط سنی بنے اور وہ ایسے سنی تھے کہ آدمی کو ان پر رشک آنا چاہیے۔ وہ فرماتے تھے کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا تو کچھ دن بعد اپنی ہمشیرہ کے ہاں آگیا اور میری ہمشیرہ کے شوہر سنی تھے، وہاں جا کر جب سنی عبادات و رسومات سامنے آئیں تو مجھے بہت اچھی معلوم ہوئیں، چناں چہ شیعوں کی جو چیزیں دیکھی تھیں، ان سے سخت نفرت ہوگئی اور میرے دل میں کچھ سوالات پیدا ہوئے۔

میں نے ان سوالات سے متعلق حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ایک خط لکھا اور اپنی ساری کیفیات اور ساری تفصیلات لکھیں اور مولانا تھانویؒ نے بہت شافی اور کافی جواب دیا۔ اس کے بعد مجھے مزید اطمینان ہوگیا اور میرے اندر اہلِ سنت مسلک کا جو ایک بیج تھا، وہ اور پختہ ہوگیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت مولانا محمد سعید صاحب قریشی رحمۃ اللہ علیہ احمد پور شرقیہ والوں سے بیعت ہونے کے واقعات تفصیل سے سنایا کرتے تھے کہ شیخ نے جب مجھے نقشبندیہ سلسلے کے اذکار دیے تو شیخ سے مجھے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ اس کا بیان مشکل ہے۔ پھر اپنی محبت کا

ایک واقعہ سنایا:

ایک مرتبہ حضرت شیخ دہلی آئے اور تانگے میں سوار ہوئے اور لوگ بھی تانگے میں بیٹھ گئے اور اس میں اتنی جگہ نہ تھی کہ میں بیٹھ سکوں، لہٰذا میں اس تانگے کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔یعنی شیخ مجھ سے دور ہو جائیں یہ میری طبیعت کو گوارا نہ تھا۔

یہ بڑی بات تھی۔ جب تک شیخ سے والہانہ محبت نہ ہو، اس وقت تک کچھ استفادہ نہیں ہوسکتا۔ یہ راستہ ایسا ہے کہ شیخ سے محبت اور تعلق جتنا قوی ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کو استفادہ ہوگا۔ مولانا زوّار حسین صاحبؒ نے ہمیں یہ احساس دلایا کہ انہیں اپنے شیخ سے بے انتہا محبت تھی اور جتنی ترقیات ہوئی ہیں، اس کا سارا انحصار شیخ سے تعلق اور محبت پر تھا۔ جب بھی شیخ دہلی وغیرہ تشریف لاتے تو وہ کبھی بھی ان کی صحبت سے غیر حاضر نہیں رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب میرے اذکار پورے ہو گئے تو حضرت محمد سعید قریشیؒ نے مجھے حضرت خواجہ فضل علی مسکین پوری کی خدمت میں پیش کر دیا اور انہوں نے مجھے اجازت وخلافت سے سرفراز کیا۔

اجازت وخلافت سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے جو بڑا اہم کام کیا، وہ تصوف اور فقہ کی کتابوں کی تالیف وتصنیف ہے۔فقہ انسان کے ابتدائی اعمال کو درست کرتی ہے اور تصوف انسان کے باطن اور قلب کی اصلاح کے لیے ہے اور یہی دونوں چیزیں ہیں جس سے انسان کے ظاہر و باطن کی حفاظت ہوتی ہے۔لہٰذا انہوں نے فقہ میں بڑا کام کیا ہے، بہت سارے فتنے ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر بدعات شروع ہوجاتی ہیں۔آپ دیکھیے بڑے بڑے سلسلے، بڑے اچھے اچھے لوگ جو پکے سنی تھے، ان میں فتنے شروع ہو گئے، یہاں تک کہ وہ شیعہ ہو گئے یا بدعتی ہو گئے۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے فقہ پر زور لگایا اور فقہ کی چار ضخیم جلدیں لکھیں۔ اگر انسان فقہ کا علم حاصل کر لے تو وہ رافضی یا بدعتی نہیں بن سکتا۔ یہ ان کی خاص حکمت تھی تا کہ انسان کے اندر بدعات پیدا نہ ہوں، کیوں کہ یہ بدعت ہی ہے، جو انسان کے اعمالِ حسنہ کو بالکل کھا جاتی ہے۔اور جو کام سنت کے مطابق ہوا گر چہ بہت حقیر اور چھوٹے سے چھوٹا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مقبول ہوگا اور بدعت کے اعتبار سے بڑے سے بڑا کام بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہ ہوگا۔اسی نکتے نے حضرت شاہ صاحبؒ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور

اسی کی بڑی ضرورت ہے۔لہٰذا ان کے جانشین مولانا زوّار حسین صاحبؒ کے مشن کو جاری رکھیں اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ اس سلسلے کو بدعات سے بچائیں، جیسا کہ مولانا زوّار حسین صاحبؒ نے اس کو سنت کے مطابق چلایا ہے، وہ بھی اس کو اسی انداز سے چلاتے رہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو ان ساری بدعات اور خرافات سے محفوظ رکھے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین